eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

"کئی چاند تھے سرِ آسماں": استفادہ، اخذ و قبول

"Kai Chand They Sar-e-Aasman": Utilization, Acquisition, and Acceptance

Dr Shahzad Islam
Assistant Professor, Department of Urdu
Govt. Graduate College, Modal Town, Lahore

ڈاکٹر شہزاد اسلام
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
گورنمنٹ گریجوایٹ کالج، ماڈل ٹاؤن، لاہور

Abstract:
Shamsur Rahman Faroqi's novel "Kai Chand They Sar-e-Aasman" is a significant and popular work in Urdu literature, presenting the cultural and historical landscape of the eighteenth and nineteenth centuries with exceptional narrative skill. To enhance the understanding of the novel, Faroqi has utilized and incorporated several historical and literary texts related to the subject matter, thereby amplifying the impact of the novel. Undoubtedly, the process of borrowing and incorporating plays a dynamic and positive role in literature. It not only brings innovation and diversity to literary creations but also promotes understanding and harmony between different cultures and languages. However, during this process, adherence to ethical and legal boundaries is crucial to avoid harming literary creativity and individuality. Faroqi has particularly kept this point in mind while utilizing and incorporating sources, which is critically and analytically discussed by the scribe in this article.

Key Words:
Shamsur Rahman Faroqi, Novel, Utilization, Adaptation and Assimilation, Haiku, Techniques

شمس الرحمن فاروقی ایک ممتاز ادبی نقاد، شاعر، افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں، جنھوں نے علم و ادب سے اپنی گہری بصیرت اور عمیق ژرف نگاہی کے ذریعے اُردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ اُن کے ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" میں تاریخی، تہذیبی اور ادبی و شعری حوالوں کا بہ کثرت استعمال دیکھنے کو ملتا ہے، جو اُن کی دیگر تخلیقی صلاحیتوں کو آشکار کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ فاروقی نے اِس ناول میں تاریخی واقعات و مقامات اور ادبی و تہذیبی شخصیات کی زندگی کو بڑی مہارت سے بُنا ہے۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے اُس دور کی نوابی معاشرت، تہذیبی اقدار اور فنونِ لطیفہ کا پُر فکر مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ خاص طور پر میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ اور دیگر کلاسیکی شعرا کے اشعار کے ساتھ ساتھ بعض نثری کتب کے اِقتباسات بھی اُنھوں نے بڑی مہارت سے اِس ناول میں تحلیل کیے ہیں۔ یہ حوالے نہ صرف اُن کے ناول کو مزید پُر تاثیر بناتے ہیں، بل کہ قاری کو اُردو ادب کے عظیم ادبی سرمائے سے بھی متعارف کرواتے ہیں۔ کہنا پڑتا ہے کہ ادبی سطح پر مذکورہ ناول کی نام وری اور کام یابی میں اِستفادہ (Utilization) و اخذ و قبول (Adaptation and Assimilation) کا بڑا ہاتھ ہے۔ "اخذ و قبول" کا مطلب ہے کہ کسی ادبی تخلیق یا نظریے کو قبول کر کے اُسے اپنی تخلیقات میں شامل کرنا یا اُس پر مباحثہ کرنا۔ بہ الفاظِ دیگر ادب میں مختلف متون (Texts)

سے مواد اخذ کرنے کے بعد اُسے روایتی ادبی اصناف میں اپنی اِحتیاج کے مطابق استعمال کرنے کا نام اخذ و قبول ہے، جس کے ذریعے ادب میں تنوع، نیاپن اور پختگی کے عناصر جنم لیتے ہیں۔

دیکھا جائے تو اِستفادہ واخذ و قبول ادب کی ترقی میں کئی حوالوں سے اہمیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر جب ایک ادیب یا شاعر دوسرے ادبا و شعرا کی تخلیقات سے اِستفادہ کرتا ہے تو وہ اُن کے علمی و فکری دائروں کو وسعت دینے کا باعث بھی بنتا ہے، جس کی بہ دولت ادبی روایت کا تسلسل بر قرار رہتا ہے۔ مزید یہ کہ اِس کے طفیل قدیم اور جدید ادبی تخلیقات کے درمیان ایک ربط پیدا ہوتا ہے، جو ادب کی تاریخ اور اُس کے اِرتقا کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ بعینہٖ اخذ و قبول سے ادبی مکالمے کی فضا پیدا ہوتی ہے، جس سے مختلف ادبا و ناقدین کے درمیان خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے، جو نئے نئے نظریات کو فروغ دینے کا باعث بنتا ہے۔ اِس کے ذریعے نت نئی ادبی تحریکات جنم لیتی ہیں، جس سے نئے نئے خیالات و نظریات کی شمولیت سے ادبی تخلیقات میں تازگی اور نیاپن پیدا ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ایک زبان یا ثقافت میں مروج فنیات (Techniques)، جب دوسری زبان میں اپنائی جاتی ہیں تو یہ ادب کی مختلف اصناف کو نئی جہات فراہم کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر جاپانی صنفِ شاعری ہائیکو (Haiku) اپنے مختصر اور جامع ہونے کی وجہ سے مغربی شاعری میں اپنی جگہ بنانے کے بعد اب دُنیا کی مختلف زبانوں میں بھی اپنا وجود منوا چکی ہے۔ اِسی طرح چینی ادب میں کنفیوشس (Confucius) (۵۵۱ق م۔۴۷۹ق م) کی تعلیمات اور ہندوستانی ادب میں ویدوں کی کہانیاں بھی اخذ و قبول کی بہ دولت مغربی دُنیا میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ گویا مختلف فلسفیانہ نظریات اور علمی مکاتبِ فکر جب ایک دوسرے سے اخذ و قبول کی روِش اختیار کرتے ہیں تو یہ علم و دانش کے میدان میں نئے زاویے اور نقطۂ نظر پیدا کرتے ہیں۔ جیسے ارسطو (Aristotal) (۳۸۴ق م۔۳۲۲ق م) کے فلسفے نے اِسلامی فلسفیوں مثلاً الفارابی (۸۷۰ء۔۹۵۰ء) اور ابنِ رشد (۱۱۲۶ء۔۱۱۹۸ء) کی تخلیقات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

لاریب ادب میں اخذ و قبول ایک ایسا مثبت رُجحان ہے، جو مختلف ثقافتوں، زبانوں اور ادبی روایات کو یکجا کرنے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اِس سے نہ صرف ادبی تخلیقات میں تنوع کے نئے در وا ہوتے ہیں، بل کہ تخلیق کاروں کو نئے نئے خیالات اور نئے نئے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ مزید یہ کہ مختلف تہذیبوں کے عناصر کے اِمتزاج سے تہذیبی ہم آہنگی میں اضافہ ہوتا ہے، جو معاشرتی سطح امن و آشتی اور عالم گیر اِنسانی اقدار کے فروغ کا باعث بھی بنتا ہے۔ بعینہٖ ادبی اخذ و قبول سے زبانوں کی ترقی و نشو و نما میں مدد ملتی ہے۔ گویا جب ایک زبان دوسری زبان سے الفاظ و محاورت یا اِظہار کے مختلف طریق اخذ کرتی ہے تو اِس سے نہ صرف زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، بل کہ اِس میں نئے نئے رُجحانات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اُردو زبان نے فارسی، عربی اور ترک زبانوں سے کئی الفاظ اور محاورے اخذ کیے ہیں، جس سے اِس زبان کی غنایت اور تاثیر میں غیر معمولی اِضافہ ہوا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اُردو ادب میں اِستفادہ واخذ و قبول کی روایت ایک دِل چسپ اور متنوع موضوع ہے، جو مختلف ادبی اور ثقافتی اثرات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ روایت اُردو ادب کی تاریخ میں مختلف ادوار اور تحریکات کے ذریعے پروان چڑھی۔ برطانوی دور میں انگریزی ادب کا اثر اُردو ادب پر واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سر سیّد احمد خان کی علی گڑھ تحریک نے جدیدیت کو اپناتے

ہوئے مغربی علوم اور مغربی ادب کو اُردو میں متعارف کروایا۔ یوں اِس دور میں داستانوی اور رومانوی ادب کے علاوہ ناول اور افسانہ ایسی اصناف بھی اُردو میں جگہ پانے لگیں۔ یہ روایت نہ صرف اُردو ادب کو غنی کرتی ہے، بل کہ اِسے عالمی ادب کا حصہ بھی بناتی ہے۔

بلاشبہ اُردو زبان کی تشکیل میں فارسی، عربی، ترکی اور ہندی زبانوں کا بڑا حصہ ہے، جس کی بہ دولت اخذ و قبول کی روایت نے اُردو ادب کو بہترین مواد، نئے الفاظ اور جان دار موضوعات فراہم کیے، جو اِس کے ارتقا میں مدد گار ثابت ہوئے۔ اُردو ادب میں مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے اثرات کی وجہ سے ایک وسیع تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ تنوع نہ صرف زبان کی ساخت، بل کہ ادب کی مختلف اصناف جیسے غزل، نظم، کہانی، افسانہ اور ناول میں بھی نظر آتا ہے۔ مزید براں دیگر زبانوں اور ادبیات سے اخذ شدہ خیالات اور اسالیب نے اُردو ادب کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اُردو ادب میں اِستفادہ و اخذ و قبول کی مستند روایت نے اُردو زبان و ادب کو کئی حوالوں سے جاذبِ نظر اور دِل کش بنا دِیا ہے۔ اِس پس منظر میں جہاں تک شمس الرحمن فاروقی کے ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" میں اِستفادہ و اخذ و قبول کا تعلق ہے تو اِس ضمن میں یہ بات لائقِ تحسین ہے کہ فاروقی نے از خود ناول کے اِختتام پر اُن تمام ذرائع اور کتب کا حوالہ درج کر دِیا ہے، جن سے اُنھوں نے مذکورہ ناول کی تیاری میں اِستفادہ و اخذ و قبول کیا ہے۔ اِس اقدام سے جہاں اُن کی علمی دیانت داری منکشف ہوتی ہے، وہاں اِس ناول کی تخلیق میں معاون مختلف النوع علوم و فنون اور حوالہ جاتی کتب سے متعلق واقفیت حاصل کرنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے اور اِس بات کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ فاروقی نے کس قدر وسعتِ معلومات سے کام لے کر اِس ناول کو تخلیق کیا ہے۔ اُنھوں نے ایسی نایاب کتب سے اِستفادہ اخذ و قبول کر کے ناول کو تو سرسبز و شاداب بنایا ہی ہے، مگر اِس کے ساتھ ساتھ ماہ و سال کی گرد میں اٹی ہوئی، اِن کتب کو بھی بارِ دِگر نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ اِن میں سے بعض کتب تو گویا قصۂ پارینہ کے مصداق معدوم ہو چکی تھیں۔ جہاں تک اِن کتب سے اِستفادہ اخذ و قبول کے انداز اور نوعیت کا تعلق ہے تو اِس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ فاروقی نے زیادہ تر معلومات یا اِقتباسات کو بعینہٖ ناول میں تحریر کا حصہ بنا دِیا ہے اور لفظی و فکری سطح پر بہت کم تبدیلیاں کی ہیں۔ مثلاً ٹھگی کے ادارے پر بحث کرتے ہوئے فاروقی لکھتے ہیں:

> "ایام مفصلۂ ذیل کو ایٹَب کہتے ہیں: جب کسی ٹھگ کی جورو بچہ جنے، یا اُس کی جورو، بیٹی پہلی بار کپڑوں سے ہووے، یا کسی ٹھگ کی بیٹی بیاہی جاوے، یا اُس کے بیٹے کی مسلمانی ہووے تو اُس دِن سے لے کر بارہ دِن تک سفر کو نہ نکلیں اور اگر سفر میں ہوں تو واپس چلے آویں۔ کسی ٹھگ کے یہاں کوئی غمی ہو جاوے تو یہی پابندی دس دِن کی ہے۔ اگر کسی ٹھگ کی سواری کا گھوڑا یا گھوڑی مر جاوے تو بھی یہی پابندی دس دِن کی ہے۔ کسی ٹھگ کی گائے یا کوئی اور چوپایہ مر جاوے تو یہی پابندی سات دِن کی ہے۔ کسی ٹھگ کی عورت معمولہ طور پر حائض ہووے، یا اُس کی بکری، کتیا، بلی، بچہ جنے، تو یہی پابندی تین دِن کی ہے۔"(۱)

لیکن مندرجہ بالا اِقتباس خفیف سے تصرف کے ساتھ دراصل علی اکبر الہٰ آبادی کی کتاب "مُصطلحاتِ ٹھگی" سے ماخوذ ہے:

> "دکھنی اور بڑاڑی ٹھگوں کی زبان میں ایامِ مفصلۂ ذیل کو کہتے ہیں؛ یعنی بارہ دِن جب کسی ٹھگ کی عورت کے لڑکا ہووے، یا کسی ٹھگ کی جورو، بیٹی وغیرہ پہلی دفعہ کپڑوں سے ہووے، یا کسی ٹھگ کی بیٹی بیاہی جاوے، یا کسی

ٹھگ کے لڑکے کی مسلمانی ہووے۔اور دس دِن، جب کسی ٹھگ کے یہاں غمی ہو جاوے، یعنی کوئی مر جاوے، خواہ بچہ ہو یا جوان یا بوڑھا۔اور یہی دس روز، جب ٹھگوں کی سواری کا کوئی گوڑا[گھوڑا]، گھوڑی سقط ہو جاوے۔اور سات دِن، جب کوئی ٹھگوں کی گاے، بھینس بچہ دیوے، یا کوئی چوپایہ مر جاوے۔اور تین دِن، جب ٹھگوں کی کوئی عورت بہ طور معمول کے حائض ہووے؛ یا بکری، کتیا، بلی بچہ جنے۔پس دکھنی اور بڑاڑی ٹھگ ان دِنوں میں گھر سے سفر کو نہ نکلیں۔ اور اگر سفر میں ہوویں اور ایسا ہووے، تو گھر کو چلے آویں۔"(۲)

اِسی طرح فاروقی گلوری اور پان کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خاص بردارنی نے مہابلی کی خدمت میں گلوریوں کے خاصدان، نگردان، رکھے۔ہر گلوری سونے کے ورق میں لپٹی ہوئی، پان کی تہوں کو برابر رکھنے کے لیے ہر گلوری میں باریک سی چاندی کی سلائی پروئی ہوئی۔"(۳)

جب کہ عرش تیموری نے اِس صورتِ حال کو اپنی کتاب "قلعہ معلی کی جھلکیاں" میں کچھ یوں پیش کیا ہے:

"قلعہ میں گلوری عموماً ڈیڑھ پان کی بنتی تھی اور اُس میں سونے، چاندی یا لوہے کی کیل لگائی جاتی تھی اور کبھی لونگ بھی۔"(۴)

قلعہ میں خاصا طناول فرمانے سے پہلے شاہی لوازمات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں:

"زنانہ تسلیمات کے ختم ہوتے ہوتے خاصے والیوں نے سات گز لمبا، تین گز چوڑا چمڑا بچھایا۔اُس پر ایک سفید دستر خوان بچھایا، اور پھر اس دستر خوان کے بالکل بیچ میں دو گز لمبی، ڈیڑھ گز چوڑی اور چھ گرہ اونچی ایک چوکی رکھی۔اُس چوکی پر پھر ایک چمڑا اور سفید دستر خوان بچھا کر بے شمار کھانے سجائے کہ سب مہر بند خوانوں میں اور خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔"(۵)

جب کہ منشی فیض الدین اپنی تصنیف "بزم آخر" میں یوں مرقوم ہیں:

"ایلو! خاصے والیوں نے پہلے ایک سات گز لمبا تین گز چکلا چمڑا بچھایا اوپر سفید دستر خوان بچھایا۔بیچوں بیچ میں دو گز لمبی ڈیڑھ گز چکلی۔چھ گز اونچی چوکی لگا۔اِس پر بھی پہلے چمڑا پھر دستر خوان بچھا۔خاص خوراک کے خوان مہر لگے ہوئے چوکی پر لگا خاصے کی داروغہ سامنے ہو بیٹھی اِس پر بادشاہ خاصہ کھائیں گے، باقی دستر خوان پر بیگماتیں۔شاہزادے شاہزادیاں کھانا کھائیں گی۔لو اب کھانا چنا جاتا ہے۔"(۶)

پھولوں کی تیاری کا منظر شمس الرحمن فاروقی نے کچھ یوں پیش کیا ہے:

"تیسرے دِن پھولوں کی تیاری ہوئی، فاتحے کے کھانے پکے۔لوگوں نے جمع ہو کر ایک ایک سیپارہ کلام پاک پڑھا۔الائچی دانوں پر ستر ستر مرتبہ کلمہ شرے پڑھا گیا پھر الائچی دانے سب میں تقسیم کیے گئے، مرحوم کے نام پر کھانا اور جوڑا اور دوشالہ خیرات کیا گیا۔بعد فاتحہ بادشاہ محل میں آئے۔مرحوم کے

بیٹوں، بہوؤں، دامادوں اور بیٹیوں کو سوگ اُتروانے کے دوشالے اور بیویوں کو رنڈسالے مرحمت فرمائے۔"

(۷)

منشی فیض الدین اِس ضمن میں اپنی تصنیف "بزمِ آخر" میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"دیکھو![دیکھو] دوسرے یا تیسرے دِن صبح کو پھولوں کی تیاری ہوئی اچھے سے اچھا کھانا پک رہا ہے۔ڈہیر[ڈھیر] سے الائچی دانے آئے سب لوگ جمع ہوئے۔ایک ایک سیپارہ قرآن شریف کا سب نے پڑھ کے سارا قرآن پورا کیا۔الائچی دانوں کے ایک ایک دانے پر ملکے[مل کے] ستر ہزار دفعہ کلمہ پڑہا[پڑھا]۔ پھر ختم ہوا قرآن شریف اور کلموں کا ثواب مرحوم کی ارواح کو بخشا۔الائچی دانے سب کو بٹ گئے بہت سا کھانا اور جوڑہ دوشالہ اللہ کے نام دیا۔"(۸)

بہادر شاہ ظفر کے کمالات کا ذکر کرتے ہوئے فاروقی لکھتے ہیں:

"بادشاہ سلامت بندوق تو ایسی لگاتے تھے کہ باید و شاید۔بارہا دیکھنے میں آیا جانور اُڑتا ہوا جاتا ہے، ہوا دار پر بندوق دھری ہے، اُٹھائی اور بے تکلف داغ دی، بندوق چھتیانے کی بھی نوبت نہ آئی۔ جانور لوٹ پوٹ ہوا اور ہوادار میں آرہا۔"(۹)

جب کہ ظہیر دہلوی "داستانِ غدر" میں یوں مرقوم ہیں:

"بندوق تو ایسی لگاتے تھے کہ باید و شاید۔ بال بیند ہا نشانہ اوڑاتے کبھی نشانہ خطا ہی نہ کرتا تھا۔ بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جانور اُڑتا ہوا جاتا ہے۔ ہوادار پر بندوق دھری ہے، اُٹھائی اور جھونک دی، چھتیانے کی حاجت نہیں لوٹ پوٹ ہوا اور ہوادار میں آرہا۔"(۱۰)

کریم خان اور نواب شمس الدین احمد خان کی گرفتاری اور پھانسی کا پیش خیمہ بننے والی تحقیقات کا منظر شمس الرحمن فاروقی نے کچھ یوں کھینچا ہے:

"ہوا یوں کہ جس دِن دریا گنج کی حویلی میں چھاپا پڑا اور گرفتاریاں ہوئیں، اُسی دِن ایک شخص کا ڈول حویلی کے سامنے والے کنویں میں گر پڑا۔ڈول کی بازیافت کے لیے مرجیا کنویں میں اُتارا گیا۔ جب وہ تھوڑی دیر بعد اُوپر آیا تو اُس کے ہاتھ میں گم شدہ ڈول کے علاوہ ایک پتھر کلہ بندوق بھی تھی جس کی نال کاٹ کر چھوٹی کر دی گئی تھی۔ غوطہ خور نے یہ بھی بتایا کہ ڈول ایک کونے میں کیچڑ میں پھنسا ہوا تھا، اُسے زور کر کے نکالا تو اُس کے پیندے میں چپکا ہوا ایک کاغذ بھی چلا آیا، جو کچھ خط وغیرہ سا معلوم ہوتا تھا۔ پولس دار نے فوراً مٹکاف صاحب بہادر کو اِس دریافت کی خبر دی اور بندوق مع کاغذ بحق سرکار کمپنی بہادر ضبط کر لی۔ مٹکاف نے کاغذ فوراً سائمن فریزر کو بھیج دِیا کہ اِس کا معائنہ ہو، عبارت کی رمز شناسی کی جاوے اور ضروری سمجھا جاوے تو کاتب کے بارے میں تحقیق ہو۔ بندوق اُس نے جان لارنس کے پاس بھیج دی کہ اُس کے مالک کا پتہ لگایا جائے۔

کاغذ ہر چند کہ بہت کچھ گل چکا تھا اور عبارت جگہ جگہ سے مٹ گئی تھی، لیکن اُس پر کچھ کیمیائی عمل کیا گیا تو زیادہ تر حروف روشن ہو گئے اور یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی خط ہے، جو نواب شمس الدین احمد خان نے کریم خان کو بسلسلۂ خریداریِ سگانِ شکاری لکھا تھا۔"(۱۱)

جب کہ مالک رام اپنی تصنیف "فسانۂ غالب" اِس ضمن میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"قتل کے دو تین دن بعد دریا گنج کے علاقے میں ایک شخص کا ڈول کنویں میں گر گیا۔ جب غوطہ خور کنویں میں اُترا، تو ڈول کے علاوہ اُس میں سے ایک بندوق بھی نکلی، جس کی نال کٹی ہوئی تھی۔ ایک لوہار نے اُسے شناخت کیا اور کہا کہ یہ بندوق کریم خان کی ہے؛ اور خود میں نے اُس کے کہنے پر اُس کی نال کاٹی تھی۔ مزید بر آں غائر معائنہ کرنے پر ثابت ہو گیا کہ جس گولی سے فریزر ہلاک ہوا تھا، وہ اِسی بندوق سے چلی تھی۔"(۱۲)

اِسی واقعے کو قدرے اِختصار کے ساتھ غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف "غالب" میں کچھ یوں درج کیا ہے:

"سیمن فریزر کو پانی کے ایک ڈول سے کاغذ کے چند پرزے مل گئے، جن کی سیاہی دُھل چکی تھی، لیکن کیمیاوی اِجزا کے استعمال سے حروف روشن ہو گئے۔ اُن پرزوں کو جوڑا گیا تو فارسی میں یہ عبارت تھی:

تم خوب جانتے ہو کہ میں نے تمھیں دہلی کس غرض سے بھیجا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میرے لیے کتے خریدنا کس قدر ضروری ہے۔ اگر اب تک کتے نہیں خریدے تو بلا تکلف یہ کام انجام دے دو۔"(۱۳)

نام ور مصور اُستاد غلام علی خان کے بارے میں فاروقی لکھتے ہیں:

"اُستاد غلام علی خان پیرانہ سری کے باوجود دربار شاہی سے اب بھی وابستہ تھے اور ظلِ سبحانی کے یہاں اُن کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ وہ مصوری کے علاوہ خوش نویسی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور علمِ مجلسی میں طاق اور بے حد خوش تقریر بھی تھے۔"(۱۴)

جب کہ سر سیّد احمد خان اُستاد غلام علی خان کے بارے میں اِظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(یہ مصوری کے ساتھ دہلی کے مشہور خوش نویس بھی تھے اور شاہی ملازمت میں منسلک تھے۔ خوش اخلاق، خوش وضع، علمِ مجلسی کے ماہر اور نہایت خوش تقریر تھے۔)"(۱۵)

بہادر شاہ ظفر کے شاہی حمام کا تذکرہ کرتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی نے لکھا ہے:

"حویلی مبارک کا حمام کوئی نہانے دھونے کا ایوان یا غسل خانہ نہ تھا۔ وہ ایک مکمل عمارت تھی، جو اپنے ہی قطعۂ زمین پر بنی ہوئی تھی، اِسے سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کا ایوان بیچ میں تھا اور اِس کے چاروں طرف دو مدور راہداریاں تھیں، جن میں حسبِ موسم ٹھنڈی یا گرم نہریں اور فوارے رواں رہتے تھے۔۔۔ عمارت کے دو درجے تھے۔ وہ درجہ جو دریائے جمنا کے رُخ پر تھا، اُسے سرد حمام اور دوسرا جو موتی مسجد کے رُخ پر تھا، اُسے گرم حمام کہتے تھے۔"(۱۶)

جب کہ مرزا فرحت اللہ بیگ اِس منظر کو اپنی تصنیف "دہلی کی آخری شمع" میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"حضرت جہاں پناہ اُس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی ہیں ؟ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے، ایک عالی شان عمارت ہے۔ اِس کے دو درجے ہیں، ایک گرم، دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رُخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں، اِن میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے، بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔" (۱۷)

اِمام بخش صہبائی کے شجرۂ نسب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

"باپ کی طرف سے وہ فاروقی تھے اور ماں کا سلسلۂ نسب غوث پاک حضرت عبد القادر جیلانی سے ملتا تھا۔" (۱۸)

جب کہ سر سیّد احمد خان اِس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"مولوی اِمام بخش متخلص بصہبائی نسب آپ کا والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے مشفقہ کی جانب سے حضرت غوث الثقلین سیّد عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے۔" (۱۹)

شمس الرحمن فاروقی قدم شریف کی تاریخی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قدم شریف کی تاریخی حقیقت تو کچھ نہ تھی، لیکن عقیدۂ عوام میں یہ بالکل اصلی سچی متبرک یادگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سمجھا جاتا تھا۔" (۲۰)

اِس حوالے سے سر سیّد احمد خان اپنی تصنیف "آثار الصنادید" میں یوں رقم طراز ہیں:

"یہ درگاہ ہے بہت نامی اور گرامی اور حقیقت میں یہ قبر ہے شاہزادہ فتح خان کی اور اِس کے اُوپر نقشِ قدم جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ جناب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ معجزہ صادر ہوا تھا اور یہ نقشِ پا ہو گیا تھا۔" (۲۱)

شمس الرحمن فاروقی نے دارابخت کی ولی عہدی کے واقعے کو کچھ اِس انداز میں رقم کیا ہے:

"ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ کو سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے۔ اُس وقت مرزا محمد دارابخت بہادر عرف میراں شاہ سب سے بڑے بیٹے تھے اور ٹامس مٹکاف نے اُنھیں پانچ اشرفیاں اُسی وقت نذر کر کے اُن کی ولی عہدی کا اعلان کر دِیا تھا۔" (۲۲)

جب کہ اسلم پرویز اپنی کتاب "بہادر شاہ ظفر" میں لکھتے ہیں:

"جامِ جہاں نما کی اِس خبر کا دِل چسپ پہلو یہ ہے کہ ظفرؔ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ظفرؔ کے جانشین کا اِنتخاب بھی عمل میں آ گیا۔ گویا اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ولی عہدی کا جو قضیہ کھڑا ہوا تھا انگریزوں نے اُس سے

سبق حاصل کرتے ہوئے ظفرؔ کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ ظفرؔ کے ولی عہد کا معاملہ بھی طے کر دیا۔ چناں چہ مرزا دارابخت، ظفرؔ کے جانشین مقرر ہوئے جنھیں طامس مٹکاف نے پانچ اشرفیاں نذر کیں۔"(۲۳)

فاروقی نے ولیم فرزیر کے قتل کے ضمن میں کریم خاں بھرمار و اور انیا میواتی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"کریم خان کو دہلی میں پڑے پڑے اب تین مہینے ہو رہے تھے اور اِس دوران فریزر پر اُس کا پنجہ قابض ہونے کا موقع تو دُور رہا، اُس نے فریزر کی جھلک بھی ایک ہی دو بار دیکھی تھی۔"(۲۴)

کالی داس گپتا رضاؔ اپنی کتاب "چار توقیتیں" میں اِس واقعہ کو کچھ اِس انداز میں لکھتے ہیں:

"شمس الدین احمد خان کے داروغۂ شکار کریم خاں کی انیا میواتی کے ساتھ دہلی میں انگریزوں کے ایجنٹ ولیم فریزر کے قتل کے لیے دہلی میں آمد، تین مہینے دہلی میں رہا، مگر ناکام لوٹا۔ پھر دہلی واپس آیا۔"(۲۵)

ولیم فرزیر کے قتل کے سلسلے میں کریم خاں بھرمار و اور انیا میواتی کی کوششوں کا ذِکر کرتے ہوئے فاروقی لکھتے ہیں:

"دوشنبہ کا دِن تھا اور ۳ مارچ کی تاریخ جب کریم خاں اور انیا دہلی پہنچے اور پہنچتے ہی اُنھوں نے یہ دِل خوش کن خبر سُنی کہ فریزر صاحب دِلّی میں موجود ہیں۔ کریم خاں نے اپنے پُرانے جاسوسوں کو فوراً کام پر لگا دِیا، لیکن اُنھیں پر تکیہ نہ کرکے اُس نے انیا کی مدد سے فریزر کی کوٹھی واقع پہاڑی اور علی پور میں لڈلو کاسل (Ludlow Castle) میں کمشنری عدالت و دفاتر پر صبح و مسا نگاہ رکھنی شروع کر دی۔ جلد ہی اُسے فریزر کے معمولات کا پتہ لگ گیا، لیکن یہ معلومات کچھ خاص اُمید افزانہ تھی، کیوں کہ دِن کے وقت فریزر کبھی تنہا باہر نہ نکلتا تھا اور نہ ہی اُس کی عام راہوں میں ایسے خطے تھے، جہاں لوگوں اور سواریوں کی آمد و رفت کم ہو اور راستہ نصف گھڑی یا اِس سے بھی کم وقت کے لیے سنسان ہو۔ فریزر کا آنا جانا زیادہ تر ٹامس مٹکاف کے یہاں اور کبھی کبھی اپنے دُور کے رشتے سے بھائی سائمن فریزر، یا اپنے پرانے دوست جیمس اسکنر (سکندر صاحب) کے یہاں تھا۔ مٹکاف کی کوٹھی، جو اُس وقت بھی مٹکاف ہاؤس کہلاتی تھی، علی پور کے بالکل آخری سرے پر تھی۔"(۲۶)

اِس ضمن میں ناصر الدین احمد خان نے مذکورہ واقعے کو کچھ اِس ڈھب سے بیان کیا ہے:

"فریزر سرکاری قیام گاہ میں جو پہاڑ کی چوٹی پر تھی، اب ہندوراؤ کے نام سے وہ مکان مشہور ہے، سکونت پذیر تھا۔ وہ روزانہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دفتر لیڈلو کیسل (Ludlow Castle) جاتا اور بعض مرتبہ شہر میں یا اُس کے مضافات میں شرفا سے ملنے یا راجاؤں سے ملاقات کرنے جاتا۔ ایسا شخص جو مثل فریزر کے بے تکلفانہ ہندوستانی شرفاء سے مخلوط ہوتا ہو۔ بندوق چلنے کے لاتعداد مواقع دے سکتا ہے، لیکن فریزر کے ساتھ متعدد سواران ہم رکاب رہتے تھے۔ کریم خاں مع ایک میواتی ملازم انیا نامی اُس کی (یعنی فریزر) کی تاک میں رہا اور موقع کا منتظر رہا، لیکن اُس کو بوقتِ شب یکّہ و تنہا نہ پایا۔"(۲۷)

اِسی طرح فاروقی مادھوراؤ سندھیا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"وہ ۲۱ ذی قعدہ، ۱۲۰۷ھ مطابق گیارہ جون، ۱۷۹۲ء کی گرم دوپہر تھی جب بارشوں کی ہلکی سی جھلک بھری ہوائیں اپنے جلو میں لیے ہوئے مادھوراؤ سندھیا نے ایک مختصر، لیکن عالی شان قافلے کے ساتھ پونا میں قدم رکھا۔ اُس کا ہم نام پیشوا اُنیس سالہ مادھوراؤ ثانی اُس کا منتظر تھا، لیکن سندھیا نے فرنگی ریزیڈنسی کے سامنے والے بڑے میدان میں خیمہ و خرگاہ قائم کیا اور دوسرے دِن نائب چھترپتی اشٹ پرتیندھی کے پیشوا عالی جاہ و آسماں بنگاہِ کیواں مرتبت و مریخ منزلت مادھوراؤ بہادر ثانی کے دربار میں حاضر ہوا۔

مادھوراؤ سندھیا قلعۂ مبارک سے نصف کوس پر ہاتھی سے اُتر گیا اور ٹانگ کی تکلیف کے باوجود باقی مسافت اُس نے پاپیادہ طے کی۔"(۲۹)

مصنف مزید لکھتے ہیں:

"مادھوراؤ سندھیا کو دیکھ کر پیشوا اپنی جگہ سے اُٹھا اور ابھی وہ چبوترے کی دوسری سیڑھی ہی طے کر رہا تھا کہ سندھیا نے آگے بڑھ کر تین تسلیمات ادا کیں، اپنا زر نگار بستہ کھول کر کولہاپوری جوتیوں کی طرح ایک مرصع جوڑی نکالی اور فارسی میں کہا:

"میرے اجداد نے اِسی کام کو اپنا سرمایۂ اِفتخار و مباحات جانا ہے، اِجازت مرحمت ہو کہ میں اِن متبرک قدموں کو جوتیاں پہنانے کی سعادت حاصل کروں۔"

مادھوراؤ ثانی نے وہیں رُک کر مسکراتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور سندھیا نے ذرا آگے بڑھ کر نئی جوتیاں پیشوا کو پہنا دیں، پُرانی جوڑی اُس نے اُسی کارچوبی بستے میں لپیٹ کر بغل میں داب لی۔"(۲۹)

جب کہ ایچ۔جی۔ کین (H.G.Keen) اپنی تصنیف "Madhava Rao Sindhia" میں یوں رقم طراز ہیں:

"He arrived at Poona on the 11th of June, 1792, and pitched in the grounds of the British Residency. Ten days later, he proceeded to wait upon the Peshwa in darbar, bringing as his offering all sorts of costly rarities and products of Hindustan. The virtual sovereign ruler of Hindustan, victorious in diplomacy or war over all opponents, lord of vast provinces and of unconquered legions, he approached the State-enclosure on foot, living his elephant and his body-guard of grenadiers under European officers at the confines of his own camp. On entering the tent he took his station below all the officials present; when the Peshwa appeared Sindhia made his obeisance with the rest; and, declining the invitation to be seated, produced a bundle, out of which he unwrapped a pair of new slippers. 'This', he murmured, 'was my father's occupation, and it must also be mine.' Then, reverently removing the slippers which the young Chief had

been wearing, he wrapped them in the cloth from which he had taken the new pair; and, having laid them before the Peshwa, permitted himself to accept the reiterated invitation to be seated, stil carrying the Peshwa's old shoes under his arm." (۳۰)

مندرجہ بالا حوالہ جات کی دلالت میں پیش کی گئی مثالوں سے بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی نے متعلقہ کتب سے تاثر قبول کرتے ہوئے بہت کم تبدیلی یا تصرف سے کام لیا ہے اور زیادہ تر الفاظ و فقرات اور فکری و معنوی صورتِ حال کو جوں کا توں پیش کر دِیا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو اِن معلومات کو اپنے الفاظ اور اپنے مخصوص اُسلوب میں بیان کر سکتے تھے، مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا، تاہم اگر وہ ایسا کرتے تو یقینا ناول کا ظاہری و باطنی حُسن دوبالا ہو جاتا۔ تاہم اِس کے باوجود اُنھوں نے اِس ناول کی تخلیق میں اُردو، فارسی، ہندی، انگریزی اور دیگر ادبی منابع سے بڑے احسن انداز میں اِستفادہ کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ فاروقی نے اُردو ناول نگاری میں ایک ایسی مختلف جہت متعارف کرائی ہے، جو قاری کو ایک منفرد اور خوش رنگ ادبی تجربہ فراہم کرتی ہے۔

اِس تناظر میں یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ ادب میں اخذ و قبول کی روایت کسی قدر ایک مثبت اور تعمیری رُجحان ہے، جو مختلف ثقافتوں، زبانوں اور ادبی روایات کو یکجا کر کے ایک جامع اور متنوع ادبی دُنیا کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف ادبی ترقی کا باعث بنتا ہے، بل کہ مختلف تہذیبوں کے مابین ہم آہنگی اور اِتحاد و تعاون کو بھی فروغ دیتا ہے اور اِس فریضے کو شمس الرحمن فاروقی نے خوب نبھایا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۱ء، ص ۵۹۲

۲۔ علی اکبر الٰہ آبادی، مصطلحاتِ ٹھگی، مرتب: رشید حسن خان، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۵ء، ص ۶۳

۳۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۴۰۷

۴۔ عرش تیموری، قلعہ معلّٰی کی جھلکیاں، مرتب: اسلم پرویز، دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۳

۵۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۴۰۷

۶۔ فیض الدین، منشی، بزمِ آخر، دہلی: کتب خانہ علم و ادب، ۱۹۴۵ء، ص ۱۲

۷۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۹۳۷

۸۔ فیض الدین، منشی، بزمِ آخر، ص ۱۰۷، ۱۰۶

۹۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۸۲۷

۱۰۔ ظہیر، ظہیر الدین، داستانِ غدر، لاہور: اکادمی پنجاب، ۱۹۵۵ء، ص ۴۲

۱۱۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۴۷۳، ۴۷۲

۱۲۔مالک رام، فسانۂ غالب، لاہور: مکتبہ شعر و ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۰، ۱۰۱
۱۳۔ مہر، غلام رسول، غالب، لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۴۶ء، ص ۵۰
۱۴۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۶۷۸
۱۵۔ سیّد احمد خان، سر، مقالاتِ سر سیّد احمد خان، مرتب: محمد اسمعیل پانی پتی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۴۷۹
۱۶۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۷۰۵
۱۷۔ فرحت اللہ بیگ، مرزا، دہلی کی آخری شمع، مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین، دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۹۱ء، ص ۵۳، ۵۴
۱۸۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۶۹۱
۱۹۔ سیّد احمد خان، سر، آثار الصنادید، مرتب: سیّد معین الحق، کراچی؛ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۶ء، ص ۳۳۲
۲۰۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۵۱۹
۲۱۔ سیّد احمد خان، سر، آثار الصنادید، ص ۱۲۱
۲۲۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۶۸۱
۲۳۔ اسلم پرویز، بہادر شاہ ظفر، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۲۰۰۹ء، ص ۴۵
۲۴۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۴۹۹
۲۵۔ کالی داس گپتا رضاؔ، چار توقیتیں، ممبئی: ساکار پبلشرز پرائی ویٹ لمٹیڈ، ۱۹۹۹ء، ص ۵۷
۲۶۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۴۵۴
۲۷۔ ناصر الدین احمد خان (مرتب)، قتلِ فریزر، دِلّی: اعلیٰ پریس بلیماران، ۱۹۵۸ء، ص ۱۵
۲۸۔ شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص ۹۵
۲۹۔ ایضاً، ص ۹۶
۳۰۔ Keene, H.G., Madhava Rao Sindhia, London: Oxford Clarendon Press, 1901, P: 165,166